تھا۔ یہاں آفتاب صاحب ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب ابھی آفتاب صاحب افسری سے اور ڈاکٹر اجمل کوٹ پتلون سے کوسوں دور تھے۔ اجمل صاحب چوڑے گھیر والی شلوار اور شیروانی میں ملبوس نظر آتے اور آفتاب صاحب سائیکل پر تخ تخ کرتے باغبانپورے سے گورنمنٹ کالج پہنچتے۔ یہاں سے نکل کر عسکری صاحب کا رخ ریڈیو سٹیشن کی طرف ہوتا جہاں ان دنوں غلام عباس موجود تھے۔ غلام عباس سے تو دلی ہی سے گاڑھی چھنتی چلی آ رہی تھی۔ یہاں آ کر حفیظ ہوشیار پوری سے بھی ربط وضبط ہو گیا۔ اور ہاں بیچ میں ایک پڑاؤ اور بھی تھا۔ کیفے اورینٹ۔

عسکری صاحب کو ان دنوں چائے خانوں میں بھی بیٹھنے کا اچھا خاصا چسکا تھا۔ چونکہ ابھی اس شہر کا کوئی ہوٹل کوئی ریستوراں ایئر کنڈیشنڈ نہیں ہوا تھا اس لئے انہیں کسی ریستوراں میں بیٹھنے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ کرشن نگر بازار کی گڑ کی چائے والی دکانوں سے لے کر لورینگ تک کسی وقت کہیں بھی پسر جاتے مگر رفتہ رفتہ کیفے اورینٹ سے زیادہ مانوس ہو گئے۔ بعد میں تو خیر صحافیوں نے چائے کا آرڈر دیئے بغیر گھنٹوں کے حساب سے بیٹھ بیٹھ کر اس ریستوراں کا حال پتلا کر دیا تھا۔ مگر شروع میں اس کا نقشہ بہت آباد تھا۔ اور کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ہرے بھرے بدن اور گورے چہرے والی اینگلو انڈین لڑکی نے اس نقشہ کو ایک اور ہی جہت عطا کر دی تھی۔ شاید ایک یہ وجہ بھی تھی کہ ان دنوں ادیب یہاں بالعموم بیٹھے نظر آتے تھے۔ چونکہ ان دنوں میرا وہاں کم کم گزر ہوتا تھا اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ عسکری صاحب وہاں کاؤنٹر سے کتنی دور یا کتنے قریب بیٹھتے تھے۔ اور علی سردار جعفری جو ان دنوں لاہور ہی میں تھے کاؤنٹر کے کس رخ بیٹھتے تھے۔ ویسے بھی سوال تو عسکری صاحب کے مضمون کے بعد قابل توجہ بنا کہ اورینٹ میں کون ادیب اس کاؤنٹر سے جسے جلوہ گہہ ناز کہنا چاہیے کتنا قریب کتنے فاصلہ پر اور کس زاویے سے بیٹھتا ہے۔

اصل میں عسکری صاحب جب سے پاکستان آئے تھے خاموش چلے آ رہے تھے۔ خود بہت چلتے تھے مگر قلم بس ''مادام بواری'' کے ترجمے اور ریڈیائی تقریروں کی حد تک چلتا تھا۔ ''جھلکیاں'' موقوف تھیں کہ ساقی فسادات اور ہجرت کی لپیٹ میں آ کر معطل ہو گیا تھا۔ باقی ادبی رسالوں میں سے کسی سے ان کی ذہنی مفاہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ خیر تو 1948ء شروع ہو چکا تھا اور عسکری صاحب ہنوز خاموش تھے۔ مگر آخر کب تک خاموش رہ سکتے تھے۔ اور ایسے وقت میں جب ادبی رسالوں میں تقسیم پر اتنا کچھ لکھا جا رہا تھا۔ میں انہیں مستقل اکسا رہا تھا کہ کسی طرح وہ کچھ ''نظام'' کے لئے لکھیں۔ تو اس پرچہ میں تھوڑی گرمی پیدا ہو۔

میں گرمی کے سامان کی توقع کس سے کر رہا ہوں۔ اور وہ آئی کہاں سے۔ دور پار کے شہر رانچی سے۔ وہاں سہیل عظیم آبادی بیٹھے تھے۔ منجملہ اور ممتاز ادیبوں کے ایک خط میں نے انہیں بھی لکھا تھا اور ''نظام'' میں لکھنے کی گزارش کی تھی۔ ان کی طرف سے جواب آیا

کہ ''نظام'' کی پالیسی پہلے ترقی پسندانہ تھی۔ اب اس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے۔ میں اس میں کیسے لکھ سکتا ہوں۔ میں نے اس بزرگ کا یہ خط ''نظام'' میں نقل کیا اور بصد ادب کچھ گزارشات کیں۔ سہیل صاحب نے بھنا کر ایک طویل خط لکھا۔ خط تو کیا خط کی صورت میں ایک مقالہ تھا جس میں انہوں نے اپنے ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے پاکستان کے قیام اور قائداعظم کے سیاسی کردار کے بارے میں اتنا گرما کر اظہار کیا تھا کہ وہ خط میرے لیے اچھا خاصا سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی مثال بن گیا۔ آخر میں لکھا تھا کہ ''اگر آپ پسند کریں تو اس خط کو بھی شائع کر دیں۔'' ساتھ میں ٹکڑا لگایا۔ ''گرچہ یہ یقین ہے کہ آپ اسے شائع نہ کر سکیں گے۔'' کیوں اس لیے کہ پاکستان میں اخباروں رسالوں کو آزادی اظہار میسر نہیں ہے۔

ویسے تو میرا دل بھی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا کہ اس تحریر کی اشاعت پرچے ہی کو نہ لے بیٹھے مگر اس بزرگ کا طعنہ مجھے کھا گیا۔ میں نے ہمت کر کے خط بغیر کسی قطع و برید کے چھاپ ڈالا۔

پرچے میں گرمی تو پھر پیدا ہونی ہی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ جو خط جو مضمون موصول ہوا وہ کسی نہ کسی رنگ سہیل عظیم آبادی کے موقف کی تائید کرتا نظر آیا۔ سب سے پہلا خط میرزا ادیب کا موصول ہوا تھا۔ خلاصہ اس کا یہ تھ کہ ریاست سے وفاداری کیا چیز ہوتی ہے۔ ''ادیب انسانیت کا پرستار ہے اس کا وطن ساری دنیا ہے۔ وہ رنگ و نسل اور جغرافیائی امتیازات کی سطح سے بہت بلند ہے۔ معاف کیجئے جس قسم کی وفاداری کا آپ اظہار کر رہے ہیں وہ ادب کے لئے اور ادب کی نشوونما کے لیے زہر ہے۔''

اب عسکری صاحب نے کسمسانا شروع کیا۔ آخر کب تک منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہتے۔ ترقی پسندوں کے قلم تو رواں تھے۔ تو عسکری صاحب نے آخر کو جھرجھری لی۔ چل مرے خامے بسم اللہ۔ مضمون لکھ کر میرے حوالے کیا کہ تم مضمون مانگ رہے تھے۔ یہ لو۔ میری تو عید ہوگئی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ بحث گویا اب شروع ہوگی۔ پاکستان آنے کے بعد عسکری صاحب کا یہ پہلا مضمون تھا۔ اس کی اشاعت نے وہ ردعمل پیدا کیا جس کی میں آس لگائے بیٹھا تھا۔ ''نظام'' میں صحیح معنوں میں اب گرمی پیدا ہوئی۔ 1948ء بھی تو اپنے جاڑے گزار کر گرمی کے موسم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اپریل کے دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ مئی سر پر تھا۔ اس مضمون میں تقسیم کے بارے میں ترقی پسند ادیبوں کے اسوقت کے رویے پر بحث کی گئی تھی۔ لڑائی کے لیے تو یہ بات ہی کافی تھی۔ مگر جس چیز نے ستم ڈھایا وہ اس مضمون میں استعمال ہونے والے دو بریکٹ تھے۔ پہلا بریکٹ یوں تھا کہ ادیبوں کے عمومی رویے پر بات کرتے کرتے عسکری صاحب نے لکھا ''یہ اردو کے ادیب لوگ۔'' اس کے آگے بریکٹ میں یہ ٹکڑا (کپلنگ کے ''بندر لوگ'' کے وزن پر)۔ دوسرا بریکٹ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ علی سردار جعفری کے بارے میں لکھا۔ اور یہ علی سردار جعفری صاحب۔

آگے بریکٹ میں یہ ٹکڑا (جوان دنوں کیفے اورینٹ میں کاؤنٹر کی طرف منہ کیے بیٹھے رہتے تھے)

ایک پاک باطن پاک نگاہ انقلابی کے کردار پر ایسا ناروا حملہ۔ بس جواب میں تلواریں نکل آئیں۔ سب سے پہلے عبداللہ ملک کے نیام سے تلوار نکلی۔ اس ہفتے جب میں انجمن کے جلسہ میں پہنچا تو عبداللہ ملک لال پیلے ہو رہے تھے۔ مضمون پڑھ چکے تھے۔ اور باری علیگ جو جلسہ کے صدر تھے انہیں سمجھا رہے تھے کہ آپ نے جو ذاتی حملے کیے ہیں وہ آپ مضمون سے خارج کر دیں تو مناسب ہوگا۔ عبداللہ ملک مزید لال پیلے ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ نے وہ مضمون پڑھا نہیں ہے کہ وہاں جعفری کے بارے میں کیا لکھا ہوا ہے۔ مجھے عسکری کہیں مل جائے تو میں اس کا گریبان پکڑ لوں۔ باری صاحب نے پھر انہیں ٹوکا اور انہیں ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

کسی نے بپھرے لہجہ میں سوال کیا "آخر یہ مضمون چھپا کہاں ہے۔"

جلسہ میں مجمع بہت تھا۔ سب نشستیں پر تھیں۔ کچھ لوگ پیچھے کھڑے تھے۔ انہیں کے بیچ میں بھی کھڑا تھا۔ اس پر مطمئن کہ مجھے کون جانتا ہے۔ عبداللہ ملک نے اچانک خشمگیں نظروں سے مجھے تاڑا۔ اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چھاپنے والا وہ کھڑا ہے۔ ہفتہ وار "نظام" میں یہ مضمون چھپا ہے۔"

ایک دم سے بہت سی غصیلی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ باری صاحب نے پوچھا "کیوں جناب' یہ مضمون آپ نے شائع کیا ہے۔"

اس براہ راست باز پرس پہ میں سٹپٹا گیا۔ اسی سٹپٹاہٹ میں میں نے یوں جواب دیا کہ "آپ یہ مضمون مجھے دلوا دیں۔ یہ بھی نظام میں چھپ جائے گا۔"

باری صاحب عبداللہ ملک کی طرف متوجہ ہوئے "ملک صاحب' یہ تو مناسب بات ہے۔"

عبداللہ ملک نے گرما کر کہا "مگر یہ مضمون اسی طرح چھپے گا' اس میں سے کوئی فقرہ قلمزد نہیں کیا جائے گا۔"

میں نے برسر محفل وعدہ کیا کہ مضمون جوں کا توں چھپے گا۔ کوئی فقرہ کوئی نقطہ قلمزد نہیں ہوگا۔

لیجئے مجھے عبداللہ ملک کا مضمون مل گیا۔ میں نے خوشی خوشی اسے جیب میں سنگوایا۔ پھر وہی اندھے والی بات۔ وہ کیا چاہے دو آنکھیں۔ یہی تو میں چاہتا تھا کہ کسی طرح پرچے میں کوئی بحث شروع ہو۔ رسالہ نظروں میں آئے اور میری ادارت چمکے۔

اگلے دن دفتر پہنچتے ہی میں نے مضمون کاتب کے حوالے کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد عبداللہ آن دھمکے "ذرا مجھے مضمون تو دکھاؤ۔ میں اس میں تھوڑی ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔"

''وہ تو کتابت ہو چکا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ دو ایک ہی فقرے ہیں۔ میں نے سوچا ہے میں انہیں قلمزد کر دوں۔''

عبداللہ ملک نے وہ فقرے جن پر باری صاحب نے انگشت نمائی کی تھی قلمزد کر دیے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا فقرے تھے۔ بہرحال قصہ یوں تھا کہ عسکری صاحب نے پاکستان سے ادیبوں کی وفاداری کا سوال اٹھایا تھا۔ عبداللہ ملک نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا کہ وفاداری کس سے' ریاست سے یا حکومت سے۔ لیجیے بحث چل پڑی۔ بس اگلے ہی ہفتے ممتاز شیریں کا ایک مراسلہ موصول ہوا۔ پھر محمود ہاشمی کا۔ اور ترقی پسندوں کے مراسلے تو آ ہی رہے تھے۔ میں خوش تھا۔

پھر جب ''ساقی'' نکل آیا تو عسکری صاحب اپنی یہ بحث وہاں لے گئے جو پاکستان سے وفاداری کے سوال سے پاکستانی ادب کے سوال پر گئی۔ پھر عسکری صاحب نے ایک اور زقند لگائی اور اسلامی ادب کا سوال کھڑا کر دیا۔ خیر عسکری صاحب کی زقندوں کا کیا پوچھو ہو۔ زقندیں تو انہوں نے ایسی ایسی بھریں کہ ایک وقت میں سوویت روس کی پالیسیوں کے سب سے بڑے وکیل وہی نظر آنے لگے۔ مگر اک ذرا ٹھہریے ابھی تو میں اس زمانے کو اپنے تصور میں لا رہا ہوں اور اس گرما گرمی' اس ہنگامہ آرائی' اس جوش و خروش کو جو اس زمانے کا لازمہ تھی۔

مشتے نمونہ از خروارے۔ ذرا انجمن کے ایک جلسہ کا اور بیان ہو جائے۔ جلسہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ لوگ رفتہ رفتہ آ رہے تھے۔ مگر منٹو صاحب پہلے سے آئے بیٹھے تھے۔ منٹو صاحب کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ انجمن کے جلسہ میں دیکھا تھا نہ حلقہ کے جلسہ میں۔ جانے کس رو میں یہاں آ گئے تھے۔ پروگرام میں ان کا افسانہ تو تھا نہیں۔ یا شاید ہو۔ اگر پروگرام میں ان کا افسانہ تھا تو وہ بہرحال پڑھا نہیں گیا۔ منٹو صاحب نے محفل ہی کو تہہ و بالا کر دیا۔ جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ صدارت کے لیے حمید اختر نے وجیہہ الدین احمد کے نام کا اعلان کیا۔ وجیہہ الدین احمد اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ کرسی صدارت پر بیٹھے ہی تھے کہ منٹو صاحب نے حمید اختر سے پوچھا ''جناب کی تعریف۔''

حمید اختر بیچارے سٹپٹا گئے۔ بولے ''وجیہہ الدین احمد ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کے صاحبزادے۔''

''مولانا صلاح الدین احمد تو خیر ہوئے۔'' منٹو صاحب بولے ''مگر یہ کون صاحب ہیں۔''

وجیہہ الدین احمد کی سمجھ میں پہلے تو کچھ نہ آیا کہ کیا کہیں۔ آخر جوابی حملہ کیا۔ بولے ''اور آپ کون صاحب ہیں۔''

''میں کون صاحب ہوں۔ تم منٹو کو نہیں جانتے۔''

پیچھے کی صفوں میں اچانک کھلبلی ہوئی۔ ضیا جالندھری بیچ میں سے کھڑے ہوئے اور منٹو صاحب کے رویے پر احتجاج کرنے لگے۔ منٹو صاحب بھی اب کھڑے ہو گئے تھے۔

''پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی''

مجھے بس آگے اتنا یاد ہے کہ اسی ہنگامے میں منٹو صاحب جلسہ سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ جلسہ کے بعد مجھے بھی منٹو صاحب ہی کی طرف جانا تھا۔ قصہ یوں تھا کہ عسکری صاحب کا جی تاثیر صاحب سے اب بھر چکا تھا۔ اب وہ روز شام کو منٹو صاحب کی طرف جایا کرتے تھے۔ تو مجھے اپنے پروگرام کے مطابق وہاں پہنچ کر عسکری صاحب سے ملنا تھا اور پھر کہیں آگے جانا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ منٹو صاحب خوش بیٹھے ہیں اور عسکری صاحب کی بھی باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔

منٹو صاحب نے مجھ سے پوچھا ''میرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا۔''

میں نے تھوڑا آنکھوں دیکھا حال سنایا۔ منٹو صاحب عسکری صاحب سے مخاطب ہوئے ''عسکری صاحب میں نے ٹھیک کیا نا۔)

عسکری صاحب نے تائید میں سر ہلایا۔ آج کل عسکری صاحب کی منٹو صاحب سے گاڑھی چھن رہی تھی۔ منٹو صاحب سے عسکری صاحب کی پہلی ملاقات دلی میں ہوئی تھی۔ مگر کیا عجب ملاقات تھی۔ دریا گنج کے تانگہ کے اڈے پر ایک سواری والا تانگہ تیار کھڑا تھا۔ تانگہ والا آواز لگا رہا تھا۔ ''بارہ کھمبے کے لیے ایک سواری۔''

بارہ کھمبے سے تھوڑا آگے ہی تو ریڈیو سٹیشن تھا اور ریڈیو جانے والے ادیبوں کا طریقہ یہی تھا کہ دریا گنج سے بیٹھے اور بارہ کھمبے اتر گئے۔ وہاں سے پیدل ریڈیو کی طرف۔ تو عسکری صاحب اس تانگہ میں بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ سواریوں میں ایک سواری منٹو صاحب بھی ہیں۔ سواریوں کے بیچ ٹھسا ٹھس بیٹھے ہوئے انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور نام بتایا۔

منٹو صاحب نے غور سے عسکری صاحب کو دیکھا اور بولے ''اچھا تم عسکری ہو۔'' ویسے عسکری صاحب ان دنوں واقعی غور سے دیکھنے کی چیز تھے۔ جب میں نے پہلے پہل انہیں دیکھا تھا تو بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ یہ عسکری صاحب ہیں۔ تو منٹو صاحب نے غور سے عسکری صاحب کو دیکھا ''اچھا تو تم عسکری ہو۔'' پھر رک کر بولے ''یار' کرشن تمہاری بہت تعریف کرتا تھا۔'' رکے' پھر بولے ''مگر کرشن کی بات کا کوئی اعتبار نہیں' جھوٹ بہت بولتا ہے۔''

کرشن چندر کو تو اس زمانے میں عسکری صاحب کی تعریف کرنی ہی چاہیے تھی۔ عسکری صاحب نے بھی تو کرشن چندر پر ایسا مضمون باندھا تھا کہ ''زندگی کے دوراہے پر'' والی کہانی میں جو رہٹ کی روں روں سنائی دیتی ہے اس میں انہیں سیاروں کے نغمہ کی گونج سنائی

دی تھی۔ مگر اب زمانہ اور تھا۔ اب کرشن چندر عسکری صاحب سے بدکے ہوئے تھے اور عسکری صاحب کرشن چندر سے فرنٹ ہو چکے تھے۔ اب ان کی منٹو صاحب سے گاڑھی چھن رہی تھی۔ عسکری صاحب کا معاملہ بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ گھڑی میں رن میں گھڑی میں بن میں۔ دیکھنے میں اکل کھرے۔ لیکن جس سے دل مل جاتا تھا فوراً ہی اس سے گھل مل بھی جاتے تھے۔ لیکن جب بھڑکتے تھے تو پھر اچانک ہی ایسے بن جاتے تھے جیسے کبھی اس شخص سے ملے ہی نہیں تھے۔ اللہ ہی جانے کیا دیکھ کر آدمی پر ریجھتے اور کونسی ادا سے بھڑک کر متنفر ہو جاتے تھے۔ ایسے کہ پھر اس سے بات کرنے' اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے تھے۔ میرے ساتھ بھی بس یہ ہوا کہ ایک ملاقات ہوئی اور بس فوراً ہی شیر و شکر ہو گئے۔

عسکری صاحب سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات ایک ٹال میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو لکڑیاں چرنے کی آواز کانوں میں آ رہی ہے۔ باہر احاطہ میں لکڑیاں چیری جا رہی تھیں' میں اندر بیٹھا عسکری صاحب کو کرشن چندر کا قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باقاعدہ ملاقات میں نے یہ سوچ کر کہا کہ اس سے پہلے جو ملاقات تھی وہ بہت بے قاعدہ بھی۔ بہت دیر تک تو میں اسی شک میں رہا کہ جس شخص سے میں مل رہا ہوں وہ محمد حسن عسکری ہے بھی یا نہیں۔ ہوا یوں کہ میرٹھ میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ کتنے نامی گرامی شاعر اس میں آئے ہوئے تھے۔ مگر میری دلچسپی اس مشاعرے میں فراق صاحب کے واسطے سے تھی۔ سو دوڑا ہوا وہاں گیا۔ مگر مشاعرے کی پچھلی صفوں میں بس کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی۔ اتنی دور سے انہیں دیکھ کر دل کو تسکین نہیں ہوئی۔ مشاعرے سے مایوس واپس آیا۔ مگر پھر ایک عجب خیال آیا۔ یہ کہ اگر فراق صاحب کو ہم اپنے کالج میں جتن کر کے لے آئیں تو قریب سے دیکھنے اور باتیں کرنے کی خواہش پوری ہو سکتی ہے لیکن کیسے لے کے آئیں۔ تقاریب کا اہتمام تو اردو سوسائٹی کیا کرتی تھی جس سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ ایسے میں مجھے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کا دھیان آیا۔ فرسٹ سکینڈ ائیر کے وقت سے ایک ہی کلاس فیلو سے میری یاد اللہ چلی آتی تھی۔ شفیق احمد سے جو اس وقت انگریزی میں ایم اے کر رہے تھے۔ اور مجھے معلوم تھا کہ اردو سوسائٹی والوں سے ان کی خوب یاد اللہ ہے۔ میں صبح ہی صبح ان کے پاس گیا اور اپنی اس خواہش کا ذکر کیا۔ فراق کی شاعری سے انہیں بھی دلچسپی چلی آتی تھی۔ بس قارورہ مل گیا۔ چھوڑیئے کہ اس دن ہم دونوں نے کتنی بھاگ دوڑ کی۔ کس طرح اردو سوسائٹی کو اس فوری تقریب کے لئے آمادہ کیا۔

کس طرح فراق صاحب کی خدمت حاضری دے کر نئے ادب پر لیکچر کی درخواست کی۔ کس طرح انہوں نے ہمارا امتحان لیا کہ

ہم نئے ادب کے معاملہ میں کتنے پانی میں ہیں۔ بس یہ سن لیجئے کہ جب ہم نے فراق صاحب کو قائل کر لیا اور جب ہم انہیں لے کر آ رہے تھے تو ان کے ہمراہ تانگہ میں ایک صاحب اور بھی بیٹھ لیے۔ برمیں نیلی گرم اچکن۔ ٹانگوں میں اٹنگا پتلی موری والا پائجامہ۔ ہم نے ان صاحب پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شخصیت میں کوئی کشش نظر آتی تو سوچتے کہ موصوف کیا بیچتے ہیں۔ مگر جب فراق صاحب نے تقریر کرتے کرتے نئے افسانے کا ذکر کیا اور ان موصوف کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ جو یہاں محمد حسن عسکری بیٹھے ہیں تو ایک دم سے ہم سب دوست چونکے۔ برابر میں بیٹھے ہوئے اس شخص کو ایک تعجب اور شک کے ساتھ سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر آپس میں نظروں نظروں میں تبادلہ خیال کیا۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا ''آپ محمد حسن عسکری ہیں۔''

''جی''

پھر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ سعید بور نے یعنی سلیم احمد کے گروپ کا وہ نوجوان جسے ہم سعید بور کہتے تھے' میری طرف دیکھا۔ تامل کیا۔ پھر وضاحت کی خاطر سوال کیا ''حرامجادی والے عسکری۔''

وہی مختصر جواب ''جی۔'' اور پھر چپ۔

عسکری صاحب سے یہ تعارف تو ہڑبڑ میں ہوا تھا۔ ہم فراق صاحب کی مدارات میں مصروف تھے۔ بیچ میں آ گئے عسکری صاحب۔ ان سے مفصل ملاقات آگے چل کر ہوئی۔ ویسے وہ ملاقات بھی بالکل غیر متوقع طور پر ہوئی۔ خیر نگر بازار کے موڑ پر ایک ٹال تھی۔ یہ سعید بور کے والد کی ٹال تھی۔ کالج کی چھٹیاں تھیں۔ سو سعید بور نے یہاں باقاعدہ بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سائیکل پر گزرتے گزرتے سوچا کہ چلو سعید بور کو بھی جھانکتے چلیں۔ اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ عسکری صاحب بیٹھے ہیں۔ مگر کس خوشی میں۔ یہ سعید بور نے بالا بالا عسکری صاحب سے کیسے رابطہ قائم کر لیا۔ اصل میں سعید بور عسکری صاحب کے بھائی محمد مثنیٰ کا کلاس فیلو تھا۔ بس اسی واسطے سے اس نے عسکری صاحب سے ملاقات کی اور اپنی ٹال کی شان دکھانے کے لیے یہاں لے آیا۔ بیچ میں ٹپک پڑا میں۔ تو صورت یہ تھی کہ باہر احاطہ میں لکڑیاں چیری جا رہی ہیں۔ اندر میں کرشن چندر کے افسانوں پر تقریر کر رہا تھا اور عسکری صاحب خاموش سن رہے تھے۔

آخر میں بولے ''ڈپٹی نذیر احمد کے ناول تو آپ نے پڑھے ہوں گے۔''

''جی پڑھے ہیں۔''

''جیسے ان کے یہاں زندہ کردار آتے ہیں مثلاً ظاہر دار بیگ۔ ایسا کوئی کردار کرشن چندر کے یہاں نظر آیا۔ اس طرح کا کوی چلتا

پھر تا کردار آپ کو یاد ہو تو بتایئے۔

میں سٹپٹا گیا۔

اٹھتے ہوئے میں نے کہا ''آپ اپنے گھر کا پتہ بتایئے۔ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔''

''نہیں میں خود آؤں گا۔ آپ اپنے گھر کا پتہ مجھے سمجھایئے۔''

میں نے گھر کا پتہ سمجھایا۔ دوسرے ہی دن دن ڈھلے آن موجود ہوئے۔ اور پھر آتے ہی چلے گئے۔ روز طے شدہ وقت پر سہ پہر کو آنا۔ تھوڑی دیر بیٹھنا۔ پھر تقاضا کرنا ''اٹھو ٹہلنے چلتے ہیں۔''

بس ایک سہ پہر ناغہ ہوا۔ مگر اس ناغے کی اطلاع دینے خود آئے۔ وقت مقررہ پر آئے۔ چار منٹ بیٹھے۔ پھر کہا کہ آج ملاقات نہیں ہو سکتی۔ میں بس بتانے آیا ہوں۔ چل رہا ہوں۔ اصل میں صبح سویرے والد کا انتقال ہو گیا۔ تدفین تو ہو گئی ہے۔ مگر تعزیت کرنے والے آ رہے ہیں۔ اس لیے مجھے گھر پر رہنا چاہیے۔''

سو بس کھڑے کھڑے آئے۔ اور واپس ہو لیے۔

والد گرامی کا بیٹے کے متعلق ایک ہی ردعمل عسکری صاحب کی زبانی مجھ تک پہنچ سکا۔ اصل میں عسکری صاحب میرٹھ میں ان دنوں بیروزگاری کے دن گزار رہے تھے۔ دن بھر پلنگ پہ لیٹے کتاب پڑھتے رہتے۔ شام کو ٹہلتے ٹہلتے میری طرف آ جاتے۔ خاندان کے ایک بزرگ نے یہ نقشہ دیکھا تو عسکری صاحب کے والد صاحب سے بولے ''بھائی' یہ تمہارا بیٹا دن بھر پڑا چارپائی کے بان توڑتا رہتا ہے۔ آخر زندگی ایسے کیسے گزرے گی۔ اسے کسی ہلہ سے لگنا چاہیے۔''

والد صاحب نے افسردہ لہجہ میں کہا ''اصل میں اس لڑکے کو لکھنے لکھانے کی لت پڑ گئی ہے۔ اسی اوھیڑ بن میں پڑا رہتا ہے۔''

اس بزرگ کو فوراً یاد آیا کہ ان کے محلہ سے ایک پندرہ روزہ پرچہ ''چنچل'' نکلتا ہے جس میں لٹیفے' چٹکلے' ایکٹرسوں کے سکینڈل' پہلوانوں کے دنگل کی خبریں اور ایسا بہت سا چٹپٹا مال پیش کیا جاتا تھا۔ کہنے لگے ''اچھا صاحبزادے کو یہ شوق ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ''چنچل'' کا ایڈیٹر ہمارا برخوردار ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گا۔ صاحبزادے اپنا مضمون وہاں بھیج دیا کریں۔''

والد صاحب نے بیٹے تک یہ پیغام پہنچایا۔ بیٹے نے بہت سعادتمندی سے جواب دیا ''جی' بہت اچھا۔''

عسکری صاحب نے پہلے مجھ کوڑھ مغز کو ایلیٹ کی شاعری پڑھا ڈالنے پر کمر باندھی۔ پھر کہا کہ ''تم فرنچ سیکھ لو۔''

میں نے کہا ''سکھا دو۔''

سوفرنچ سکھانی شروع کردی۔ کرشن چندر کی مسلسل مدح سن کر مس مان کی ٹرائی لوجی پڑھنے کو دی۔ ''اسے پڑھو۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ افسانہ اور ناول کیا ہوتا ہے۔''

مگر یہ سلسلہ میرٹھ تک چلا۔ لاہور میں آ کر اس کی تجدید نہیں ہوئی۔ عسکری صاحب کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ ان تلوں میں اتنا ہی تیل ہے کہ بس افسانے میں کیلا کاٹی کر لیا کرے۔ ادھر یہ شوق وافر تھا کہ اپنے علم کے چراغ سے دوسرے چراغ روشن کیے جائیں۔ آگے چل کر انہوں نے سلیم احمد پر ریاض کیا۔ کس گرمجوشی سے اپنے علم سے اس کے سینے کو منور کرنے کی کوشش کی۔ ادھر اس عزیز نے بھی مرشد کا سارا علم اپنے اندر اتار لینے کی بہت سعی جمیل کی۔ پھر کیا ہوا۔ مگر یہ تو میں بہت آگے نکل گیا۔ میں ذکر یہ کر رہا تھا کہ عسکری صاحب کا طور یہ ٹھہرا تھا کہ روز دن ڈھلے آتے۔ پہلے فرنچ کا سبق پڑھاتے۔ پھر ہم ٹہلنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ شروع میں تو بس سڑکوں سڑکوں بھٹکتے پھرتے تھے۔ پھر پڑاؤ کرنے کے لیے ایک ٹھکانا میسر آ گیا۔ ہمارے استاد پروفیسر کرار حسین کی بیٹھک۔ کیا خوب جگہ تھی۔ خاکسار تحریک سے جو نوجوان بغاوت کرتا وہ اچھرہ 'لاہور سے بستر بوریا باندھتا اور یہاں آ کر ڈیرے ڈال دیتا۔ ادھر شہر کا ہر رنگ کا معزز چل کر یہاں آتا اور کرار صاحب کی گفتگو سے سیراب ہو کر جاتا۔ ہم جیسے طالب علموں کا بھی پھیرا لگتا رہتا۔ اب عسکری صاحب نے یہاں باقاعدگی سے روز شام کو آنا شروع کر دیا تھا۔

شروع میں میرا گمان یہ تھا کہ عسکری صاحب خالص ادب کے آدمی ہیں۔ مگر وہ تو ساتھ ساتھ میں مسلم لیگی بھی نکلے۔ اور ایسے ویسے مسلم لیگی۔ بس مت پوچھو۔ کرار صاحب کے یہاں ابھی تک صرف خاکساری نقطہ نظر سے یا رد خاکساری نقطہ نظر سے ملت اسلامیہ کے حالات کے تجزیے ہوتے تھے۔ اب یہاں مسلم لیگ کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

اعلان پاکستان کے بعد کے دنوں میں جب قریب و دور سے فسادات کی خبریں آ رہی تھیں اور ہر مسلمان سراسیمہ نظر آتا تھا عسکری صاحب کو دور کی سوجھی۔ تجویز پیش کی کہ میرٹھ میں ایک ہند اسلامی کلچرل کانفرنس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے سیاسی جدوجہد کا باب بند ہو گیا۔ اب کلچرل سطح پر جدوجہد کر کے اپنے آپ کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

کرار صاحب نے اس تجویز پر صاد کیا اور وہ جو انہوں نے خاکسار تحریک سے ٹوٹ کر اپنی اسلامی انقلابی تحریک شروع کر رکھی تھی اس کی طرف سے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ لیجیے منصوبہ بندیاں شروع ہو گئیں۔ اور ایک روز عسکری صاحب نے جھرجھری لی اور دلی جا کر ان مسلمان رہنماؤں سے جو لوک سبھا کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے وہاں آئے ہوئے تھے ملنے کی ٹھانی۔ میں ان کے ہمرکاب تھا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس بہانے مولانا حسرت موہانی کو دیکھنے 'ان کی باتیں سننے کا موقع ملے گا۔ مگر وہ تو ابھی دلی پہنچے

ہی نہیں تھے۔ یوپی کے کئی رہنماؤں سے عسکری صاحب ملے۔ جس سے اس منصوبے کی بات کی اس نے عسکری صاحب کو حیرت سے دیکھا۔ تامل کیا' پھر سمجھایا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ ایسے منصوبوں کے لیے وقت سازگار نہیں۔

عسکری صاحب ان رہنماؤں کو برا بھلا کہتے واپس آئے۔ لیکن شاید وہ رہنما ہی صحیح تھے۔ دیکھتے دیکھتے آسمان نے ایسا رنگ بدلا کہ سارا نقشہ ہی ابتر ہوگیا۔ دلی میں وہ تباہی آئی کہ مسلمانوں کے محلے اجڑنے لگے۔ پرانے قلعہ میں کیمپ لگنے لگے۔ میرٹھ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اسپیشل ٹرینیں چلنے لگیں۔

''کوئی آگے گیا باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں''

ہند اسلامی کلچرل کانفرنس کے منصوبے پہ اوس پڑ گئی۔ لوگوں کو جانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ کہاں کی رباعی کہاں کی غزل اور کیسا ہند اسلامی کلچر۔ مگر خیر

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہوئے

پاکستان میں آ کر عسکری صاحب نے اس قبیل کے ارمان خوب پورے کیے۔ لاہور پہنچ کر وہ صرف چند مہینے چپ بیٹھے۔ پھر ایسے رواں ہوئے کہ اللہ دے اور بندے لے۔ خاموشی کے وہ چند مہینے بھی ایک طرح کی مجبوری تھے۔ کرتے کیا' کیسے قلم اٹھاتے۔ شہر میں ترقی پسند کوس لمن الملکی بجا رہے تھے۔ لاہور سے کراچی تک ان کا طوطی بول رہا تھا۔ ویسے بھی پورے برصغیر میں یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ جو ترقی پسند نہیں بھی تھے وہ بھی کسی نہ کسی طور ان سے اثر قبول کر رہے تھے۔ اگر کوئی مخالف بھی تھا تو اس کی مجال تھی کہ ان کے مقابلہ میں چوں کر جائے۔

ہاں اس شہر میں ادب کا ایک کھونٹا اور بھی تھا۔ حلقہ ارباب ذوق۔ اتوار کی اتوار وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں اس کی نشست سجتی۔ مگر اس کا رنگ انجمن کی نشست سے کتنا مختلف ہوتا۔ انجمن کے جلسہ میں ہر پھر کر وہی بحث کہ ادب اور زندگی میں کیا رشتہ ہے۔ جلسہ کے ختم ہوتے ہوتے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا۔ دوٹوک فیصلہ کہ ادب زندگی ہے اور زندگی ادب ہے۔ اور خود زندگی کیا ہے۔ سماجی معاملات اور اپنے وقت کے سیاسی مسائل۔ جو ادیب ان سے آنکھ چراتا ہے وہ زندگی سے بھاگتا ہے۔ پس وہ فراری ادیب ہے۔ ادھر حلقہ میں جو سوال اٹھتے وہ طے ہونے ہی میں نہ آتے۔ نظم پڑھی جاتی تو سوال اٹھ کھڑا ہوتا کہ شاعری کیا ہوتی ہے۔ ڈرامہ پڑھا جاتا تو پوچھا جاتا کہ ڈرامہ ہوتا کیا ہے۔ اصغر بٹ یہاں ڈرامے کے ایکسپرٹ کے طور پر بیٹھے نظر آتے۔ فوراً بتانا شروع

کر دیتے کہ ڈرامہ کیا ہوتا ہے۔ کبھی یہ بحث شروع ہو جاتی کہ غزل کی تعریف کیا ہے۔ جتنی بحث ہوتی اتنا مسئلہ الجھتا جاتا۔ جلسہ ختم ہو جاتا اور مسئلہ جوں کا توں رہتا۔

اشخاص کا معاملہ یہ تھا کہ کوئی بحث میں رواں مگر قلم کا کوتاہ۔ کسی کا قلم چلتا ہے مگر بحث میں زبان لڑکھڑاتی ہے۔ انجم رومانی والا حال کہ شعر ٹھکا ہوا کہتے تھے' مگر فقرہ جب منہ سے نکالا نکلتے ہی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ یوسف ظفر اور شیر محمد اختر جب برابر برابر بیٹھتے تو شتر گربہ کی صورت پیدا ہو جاتی۔ یوسف ظفر آدمی مختصر' پستہ قد۔ شیر محمد اختر لمبے تڑنگے' چوڑے چکلے۔ پنجاب کے روایتی قدوقامت کی سچی مثال۔ اک ذرا ہکلاتے تھے۔ پھر بھی بحث میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ فرائڈ کے متوالے تھے۔ کسی بھی مسئلہ پر بحث ہوتی فرائڈ کو درمیان میں لے آتے اور تان اس پر توڑتے کہ ''س۔س۔سب' س۔ب۔سیکس ہے۔''

شیر محمد اختر نے ان دنوں بیڈن روڈ پر ایک دوست کے ساتھ مل کر کتابوں کی ایک ایسی دکان کھولی تھی جہاں صرف نفسیات کی کتابیں دستیاب تھیں۔ اس دوست کا نام بھی اتفاق سے اختر تھا۔ دکان کا نام رکھا گیا' اختر اور اختر حفیظ ہوشیار پوری کو ایسا موقع خدا دے۔ ہجو اور قطعہ تاریخ لکھنے کے لیے بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ دکان کو دیکھا اور فوراً رواں ہو گئے۔ ہجو کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے

ہے ان کا نام اختر اور اختر
یہ دو پاجی کتابیں بیچتے ہیں

تو یہ تھا ان دنوں حلقہ ارباب ذوق کا رنگ۔ یار لوگ سمجھتے ہیں حلقہ کی انجمن ترقی پسند مصنفین سے نظریاتی جنگ تھی۔ بعض ترقی پسند بھی یہی کہتے سنے گئے ہیں۔ بالکل غلط۔ حلقہ تو نظریاتی جنگ کا قائل ہی نہیں تھا۔ ترقی پسندوں کے خلاف ان دنوں جو ادیب صف آرا ہوئے دوسرا جوان کے خلاف میدان میں اترا وہ خود تحریک سے بچھڑ کر اب آمادہ بغاوت تھا۔ ''نظام'' میں جب عسکری صاحب کے مضمون پر بحث چلی تو مجھے بھی یہی گمان تھا کہ حلقہ کے ادیب ان کے موقف کی حمایت میں لکھیں گے۔ یہی سوچ کر میں نے ان سے رجوع کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ جو مکتوب جو مضمون موصول ہوتا وہ عبداللہ ملک کے موقف کی تائید کرتا نظر آتا۔ میں نے یہ سوچ کر حلقہ والوں سے رجوع کیا کہ یہ ترقی پسند تحریک سے الگ ایک مکتبہ فکر ہے۔ ان سے ترقی پسندوں کے موقف سے ہٹ کر بات کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس وقت حلقہ کی نمایاں شخصیتیں تو یہی تھیں۔ قیوم نظر' یوسف ظفر' مختار صدیقی میں نے سب سے پہلے قیوم نظر سے رجوع کیا۔ میں نے ان سے بڑے ادب سے گزارش کی جلسہ کے بعد انہیں گھیر لیا' عسکری صاحب کے مضمون پر جو بحث چل رہی ہے وہ آپ کی

نظر سے گزری۔"

"ہاں بالکل گزری۔"

"پھر آپ اس کے سلسلہ میں کوئی رائے ظاہر کرنا' کچھ لکھنا پسند کریں گے۔"

قیوم نظر نے ایک اونچا قہقہہ لگایا "چھڈ و جی۔کوئی کام کی بات کرو۔"

پھر میں نے یوسف ظفر سے رجوع کیا۔ جواب میں مسکرائے۔"برادر یہ ادیب کا کام نہیں ہے۔"

جب میں نے مختار صدیقی سے یہ گذارش کی تو انہوں نے پہلے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا۔ پھر بولے' یہ تم کس دھندے میں پڑ گئے ہو۔"

اس مختصر جواب پر انہوں نے بس نہیں کی۔ انہوں نے مجھے ساتھ لیا۔ مال روڈ کے ایک ریستوراں میں جو بلیو ریستوراں کے نام سے نیا نیا کھلا تھا' جا کر چائے کا آرڈر دیا اور مجھے سمجھانا شروع کیا کہ ادیب کا منصب کیا ہے اور ادب کس قسم کا خلوص اور یکسوئی مانگتا ہے۔

مختار صدیقی کی اس شفقت کی ایک وجہ تھی۔ ابھی پچھلے مہینے میں نے حلقہ میں اپنا افسانہ سنایا تھا۔ یہ گویا حلقہ میں میری مہورت تھی۔ مختار صدیقی اس جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ اور اس افسانے پر سب سے بڑھ کر انہوں نے ہی مجھے داد دی تھی۔ تو اب مجھے وہ ایک ہونہار افسانہ نگار سمجھتے تھے۔ اور ایک مشفق کی حیثیت سے انہوں نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ اس نوخیز افسانہ نگار کو جو گمراہی کے رستے پہ چل پڑا ہے ادب کی سیدھی راہ دکھائی جائے۔

تو ذکر یہ تھا کہ عسکری صاحب پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے کے لیے تلے بیٹھے تھے۔ مگر انہیں کوئی ہمنوا نہیں مل رہا تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر تاثیر نمودار ہوئے۔ قاعدے سے تو اس ادبی محفل کے بعد جو ابھی پچھلے دنوں گورنمنٹ کالج میں ہوئی تھی عسکری صاحب کی تاثیر صاحب سے ٹھن جانی چاہیے تھی۔ بخاری صاحب جو ان دونوں کالج کے پرنسپل تھے صدارت کر رہے تھے۔ عسکری صاحب نے مقالہ پڑھا "مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی" اس محفل میں تاثیر صاحب بھی تھے۔ بخاری صاحب نے مقالہ کے بعد تاثیر صاحب کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ان نظروں نے تاثیر صاحب کے لیے قمچی کا کام کیا۔ پھڑکے اور دم کے دم میں زقندیں بھرنے لگے۔ مارکسیت کے جو خصوصی مطالعے کیے گئے تھے اس کا انہوں نے پورا دفتر کھول دیا۔ ایک ایک کتاب کا نام لیتے اور پوچھتے عسکری صاحب' یہ کتاب تو آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ اور عسکری صاحب سادگی سے جواب دیتے کہ نہیں۔

عسکری صاحب کے یہاں ''جی'' کا استعمال تو پہلے بھی دیکھا تھا' آگے چل کر بھی بہت دیکھا۔ مگر اس سادگی سے ''نہیں'' کا استعمال میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ ''جی'' کے استعمال کی صورت یہ تھی کہ کوئی بحث کا ذہنی انٹلکچوئل آ کر عسکری صاحب سے بھڑ جاتا تو عسکری صاحب بحث سے بچنے کا راستہ یہ نکالتے کہ کسی بات پر اختلاف ہی نہیں کر رہے۔ اختلاف کریں تو بحث چلے۔ مگر یہاں ہر بات ہر بیان پہ کہنا کہ جی۔ جی ہاں۔ مگر انہوں نے تاثیر صاحب کے ہر سوال کا جواب نہیں سے دیا۔ فلاں کتاب پڑھی ہے۔ نہیں۔ اور فلاں کتاب تو پڑھی ہوگی۔ نہیں۔

تاثیر صاحب دیر تک یہی سمجھتے رہے کہ انہوں نے عسکری صاحب کو پچھاڑ لیا ہے۔ مگر جب آخر تک ہر سوال کا جواب ایک مختصر نہیں میں آیا تو پھر شاید دل میں سوچا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

تو قاعدے سے تو اس محفل کے بعد ہی بیلوں کی لڑائی شروع ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر قدرت کو شاید ہی منظور تھا کہ پہلے گاڑھی چھنے' پھر لڑائی ٹھنے۔ تاثیر صاحب ترقی پسند تحریک سے بدکے ہوئے تھے۔ ان کے یہاں پاکستانیت زور مار رہی تھی۔ اسی زور میں وہ ابھی پچھلے دنوں ہونے والی ترقی پسند کانفرنس میں اپنے اختلاف کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ عسکری صاحب کا اس تحریک سے پہلے ہی بیر چلا آ رہا تھا۔ پاکستان کے قیام نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ عسکری صاحب کے لیے سب سے پہلے ادب مقدم تھا۔ باقی ہر چیز ثانوی تھی۔ اب ان کے لیے پاکستان مقدم ٹھہرا۔ باقی ہر چیز ثانوی۔ سو وہ ادب کو پاکستان کے تابع دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ترقی پسند تو پہلے ہی ادب کو مارکسیت کی کنیزی میں دے چکے تھے۔ ان کا تقسیم کے بارے میں اپنا ردعمل تھا۔ بس ان حالات میں عسکری تاثیر اتحاد وجود میں آیا۔

''یہ اتحاد مبارک ہو مومنوں کے لیے''

مگر ترقی پسندوں کے لیے یہ اتحاد کوئی نیک شگن نہیں تھا۔ دو تو چون کے بھی برے ہوتے ہیں۔ اور یہ دو تو اپنی اپنی جگہ ادب میں بڑی حیثیت رکھتے تھے۔ سو یہ اتحاد ترقی پسندوں پر بھاری پڑا۔ یہ اتحاد لمبا نہیں کھنچا۔ اصل میں تھوڑے ہی دنوں میں ایک اور اتحاد نے اس اتحاد کا رستہ کاٹ دیا۔ منٹو صاحب تاثیر صاحب کی بلیک لسٹ میں تھے۔ ان کا کوئی دوست منٹو سے پینگیں بڑھائے یہ بات انہیں کیسے بھا سکتی تھی۔ عسکری صاحب نے بھانپ لیا اور بس بدک گئے۔ اور ایسے بدکے کہ اپنی زندگی کا سب سے تیز مضمون انہوں نے شاید تاثیر صاحب ہی کے خلاف لکھا۔

تو اب عسکری صاحب نے ایک نئے گھر کا رستہ دیکھ لیا تھا۔ تاثیر صاحب سے یاری کٹ۔ اب روز شام کو وہ لکشمی منشن کی طرف

جاتے نظر آتے جہاں منٹو صاحب رہتے تھے۔

عسکری منٹو دوستی بہت بار آور ثابت ہوئی۔ عسکری صاحب کو جس شے کی اس وقت تلاش تھی وہ اولاً منٹو صاحب ہی کے یہاں سے انہیں دستیاب ہوئی۔ اصل میں وہ پاکستانی ادب کی ضروریات کا اعلان تو کر بیٹھے تھے۔ مگر انہیں کوئی ایسا نمونہ دستیاب نہیں ہو رہا تھا جسے وہ اعتماد کے ساتھ پاکستانی ادب کے طور پر پیش کر سکیں۔ ''کھول دو'' نے ان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ ادھر کراچی میں ممتاز شیریں نے پاکستانی ادب کے دو نمونے دریافت کیے۔ قدرت اللہ شہاب کی طویل مختصر کہانی ''یا خدا'' اور محمود ہاشمی کے رپورتاژوں کا مجموعہ ''کشمیر اداس ہے۔'' عسکری صاحب اور ممتاز شیریں کو اول اول انہیں تین نمونوں پر گزارہ کرنا پڑا۔

ترقی پسندوں کو ''کھول دو'' کی حد تک منٹو صاحب سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ فسانہ اس کے لیے قابل قبول تھا۔ جب حکومت کو اس پر اعتراض ہوا تو اور زیادہ قابل قبول ہو گیا۔ تین ترقی پسند رسالوں ''سویرا'' ''ادب لطیف'' اور ''نقوش'' پر بیک وقت سرکاری عتاب آیا تھا۔ ان میں نقوش کی بڑی خطا یہ تھی کہ اس میں ''کھول دو'' شائع ہوا تھا۔ سرکاری کاروائی کے خلاف ترقی پسند ادیبوں کو تو احتجاج کرنا ہی تھا۔ عسکری صاحب بھی اس احتجاج میں پیش پیش تھے۔ عسکری صاحب ترقی پسند ادب پر اعتراض کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ سرکار کو یہ حق دینے کے روادار نہیں تھے۔

''کھول دو'' سے ''سیاہ حاشیے'' تک آتے آتے ادبی سیاست بدل چکی تھی۔ اب ترقی پسند منٹو صاحب سے فرنٹ تھے۔ منٹو صاحب نے ایک ستم تو یہ کیا کہ ''سیاہ حاشیے'' میں ترقی پسند تحریک کی منظور کردہ انسان دوستی سے تجاوز کر کے وہ انداز نظر اپنایا جیسے ترقی پسند غیر انسانی اور سفاکی کا رویہ بتاتے تھے۔ اوپر سے یہ قہر ڈھایا کہ اس مجموعہ کا دیباچہ عسکری صاحب سے لکھوایا۔ سو اس کتاب پر بہت لے دے ہوئی۔ سب سے کڑی تنقید احمد ندیم قاسمی نے کی۔ پھر جوش میں آ کر انہوں نے منٹو کے نام ایک کھلی چھٹی لکھی۔

کھلی چھٹی کے جواب میں کوئی کھلی چھٹی تو نہیں آئی۔ مگر جب منٹو صاحب ''یزید'' کا اختتامیہ لکھنے بیٹھے تو انہوں نے لگتے ہاتھوں اس چٹھی کا بھی مختصر جواب لکھ ڈالا۔ ''سیاہ حاشیے'' کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسندوں کے ردعمل کا ذکر کیا اور کہا ''میرے ایک عزیز دوست نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے لاشوں کی جیبوں میں سے سگریٹ کے ٹکڑے، انگوٹھیاں اور اس قسم کی دوسری چیزیں نکال نکال کر جمع کی ہیں۔ اس عزیز نے میرے نام ایک کھلی چھٹی بھی شائع کی جو وہ بڑی آسانی سے مجھے خود دے سکتے تھے..... مجھے غصہ تھا اس کا نہیں کہ مجھے الف نے کیوں غلط سمجھا۔ مجھے غصہ تھا اس بات کا کہ الف نے محض فیشن کے طور پر ایک سقیم و عقیم تحریک کی انگلی پکڑ کر بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو کے اشارے پر میری نیت پر شک کیا اور مجھے اس کسوٹی پر پرکھا جس پر صرف ''سرخی'' ہی سونا تھی۔''

یہ بحث گرم تھی کہ ایک نئے رسالے کی دھوم پڑی۔ اس وقت دنیائے ادب میں لاہور کے تین رسالوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ''سویرا'' اور ''ادب لطیف'' تو پہلے سے جاری تھے۔ ''نقوش'' نیا نیا نکلا تھا۔ تینوں ترقی پسند ادب کے ترجمان تھے اور انقلاب کی ڈونڈی پیٹ رہے تھے۔ رہے ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' سوان کا وہی رنگ تھا جو حلقہ کا کہ نا کا ہو سے دوستی نا کا ہو سے بیری نہ کسی نظریے کی حمایت نہ مخالفت۔ عہد میں برپا ہنگاموں سے بے تعلق خاموشی سے خالص ادب کی راہ پر رواں دواں۔ مگر اب کتب جدید نے ایک نئے ادبی رسالہ کا ڈول ڈالا۔ نام تھا ''اردو ادب۔'' ایڈیٹر تھے منٹو اور عسکری۔ مطلب یہ تھا کہ ترقی پسند یہ نہ سمجھیں کہ ان کا نام پوچھنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ ویسے تو بس دو ہی پرچے نکلے۔ مگر کس دھوم سے نکلے اور اگلے پچھلے کتنے حساب چکائے گئے۔ پھر عسکری صاحب کے ''اسلامی ادب'' کا شگوفہ بھی تو یہیں سے پھوٹا تھا۔

تو خیر اب منٹو صاحب ترقی پسند تحریک کے معتوب تھے۔ مگر اسی ہنگام انہیں دو کام کے نقاد میسر آ گئے۔ عسکری اور ممتاز شیریں۔ نقادوں کی ایسی جوڑی بھلا اور کس افسانہ نگار کس شاعر کو میسر آئی تھی اور ممتاز شیریں تو پھر رفتہ رفتہ منٹو کے افسانے ہی کی حور ہیں۔ اصل میں ان دونوں نقادوں کی فکر میں ہم آہنگی تھی، مگر مزاج مختلف تھا۔ ممتاز شیریں کے مزاج میں استقلال تھا۔ سوان کی پسند لمبی چلتی تھی۔ اور منٹو صاحب کو پسند کرنے کے بعد تو انہوں نے جیسے طے کر لیا ہو کہ یک گیر و محکم گیری سو پھر ان کی تنقید منٹو کے افسانے ہی کے لیے وقف ہو گئی۔

عسکری صاحب کی طبیعت سیمابی تھی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ذہن ابھی یہاں اور ابھی زقند بھر کے وہاں۔ سو نقاد بے اعتبارے تھے۔ جانے کب کس لکھنے والے پہ ریجھ جائیں اور کب اس سے آنکھ پھیر لیں۔ کرشن چندر کے لیے کس طرح آسمان سے ستارے توڑ کر لائے اور پھر کس طرح اس سے فرنٹ ہوئے۔ ناصر کاظمی پر کس طرح فدا ہوئے اور پھر کیسا نئی نسل کی بات کرنے پر اس سے بدکے۔ خیر ناصر کاظمی پر اس وقت تو انہیں ریجھنا ہی تھا۔ اصل میں اس وقت انہیں ایک سچے پاکستانی شاعر کی اشد ضرورت تھی۔ ویسے تو انہیں اپنے زمانے کے شاعری کے سارے تقاضے فراق کی غزل سے پورے ہوتے نظر آتے تھے۔ سو اول میر، دوم فراق۔ آ گئے تمت بالخیری مگر اب درمیان میں پاکستان کی آ پڑی تھی۔ افسانے میں تو منٹو صاحب مل گئے۔ شاعری میں کیا کیا جائے

''موذن مرحبا بروقت بولا''

ناصر کی غزل کیسے صحیح وقت پر نمودار ہوئی۔ کیا خوب شاعر دستیاب ہوا۔ میر کا ماننے والا۔ فراق کا چاہنے والا۔ غزل کھری۔ ترقی پسندی کی آلائش سے پاک، فسادات اور ہجرت کا بیان۔ مگر داغ داغ اجالے کے رنگ سے نہیں بلکہ ایک تخلیقی تجربے کی کیفیت کے

ساتھ۔ یہ غزل اس وقت عسکری صاحب کی ساری خواہشات کو قومی و نیز ادبی' پوری کرتی نظر آ رہی تھی۔ سو انہوں نے اسے فوراً ہی لپک لیا۔ باقی آگے چل کر ناصر نئی نسل کا قصہ نہ چھیڑتا تو بھی عسکری صاحب کو اس سے منہ موڑنا ہی تھا۔ ذہنی رویہ اور اس کے ساتھ پسند بدلتی جو چلی جا رہی تھی۔ تھوڑے دن سلیم سے بھی اپنی پسند کی نئی شاعری کرا کے دیکھ لی۔ مگر آخر میں روایت کے ایسے قائل ہوئے کہ انہوں نے اس واسطے سے صبر سہارنپوری کو ٹٹول نکالا اور تنقید کی دنیا میں مولانا اشرف علی تھانوی کو ایک بڑے نقاد کے طور پر دریافت کیا۔ کون فلابیر' کون جوائس اور کون پاؤنڈ۔ یہ جس کھیت کی مولیاں تھیں اب عسکری صاحب اس کھیت ہی سے بدک چکے تھے۔

عسکری صاحب رجھتے بھی جلدی تھے اور بدکتے بھی جلدی تھے۔ ان کے رجھنے اور بدکنے کی منطق کبھی تو سمجھ میں آتی تھی اور کبھی بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ویسے بدکتے زیادہ تھے۔ عجب عجب ان کے طور تھے۔ پیدل چلنے کے بہت قائل تھے۔ اور جب لاہور کی مال روڈ پر آپ پیدل چل رہے ہوں اور زمانہ وہ ہو جب مال روڈ پر یار اہلے گہلے پھرا کرتے تھے تو پھر کسی نہ کسی شناسا سے تو آپ کی مڈھ بھیڑ ہوگی۔ عسکری صاحب کس پھرتی سے اس سے پیچھا چھڑاتے تھے۔ وہ بڑے ذوق و شوق سے عسکری صاحب سے استفسارات کر رہا ہے اور عسکری صاحب جی جی کہتے چلے جا رہے ہیں۔ آ گیا چوراہا۔ عسکری صاحب ٹھٹھکے "آپ کو کدھر جانا ہے۔" اس شریف آدمی نے یہ سوچ کر کہ عسکری صاحب مال روڈ پر سیدھے ہی جائیں گے کہا کہ "مال ہی پر جا رہا ہوں۔"

"اچھا پھر مجھے تو ادھر بیڈن روڈ پر جانا ہے۔" جلدی سے ہاتھ ملایا اور مال سے بیڈن کی طرف مڑ گئے۔ ادھر وہ غریب حیران کہ یہ کیا ہوا۔

چائے خانے میں یا کسی دوست کے ڈرائنگ روم میں ڈھائی تین دوستوں کے بیچ بیٹھے چہک رہے ہیں۔ بس ڈھائی تین دوست ایسے جن سے پوری اپنائیت ہو ان میں بیٹھ کر تو خوب چہکتے تھے۔ آن نازل ہوا کوئی اجنبی۔ یعنی ان دوستوں میں سے کسی کا دوست مگر عسکری صاحب کے لیے اجنبی۔ بس چپ لگ گئی۔ اب ہم انہیں ٹھوک رہے ہیں اور وہ وہاں ہوں سے آگے ہی نہیں بڑھ رہے۔ ویسے دوستوں میں بھی کسی وقت کسی سے فرنٹ ہو سکتے تھے۔ ایسوں سے بھی فرنٹ ہوتے دیکھا جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ مزاج کے خلاف طور اطوار دیکھے اور بس بدک گئے۔ یا دیکھا کہ شاگرد عزیز کے لچھن اب اور ہیں۔ بس منہ پھیر لیا۔ ایک وقت میں کچھ حرکتیں تو میری بھی ناپسندیدہ ٹھہری تھیں۔ اور ٹھہرنی ہی تھیں۔ میں نے تو نئی نسل کے بھرے میں ان کے خلاف ایک دو مضمون بھی کھینچ ڈالے تھے۔ مگر ردعمل ظاہر ہوا بھی تو طنز' تعریض اور تضحیک کی شکل میں۔ ہاں غصے کا خط ایک دفعہ موصول ہوا تھا۔ میں کراچی گیا۔

ٹی وی پر افتخار عارف سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں کراچی سٹیشن نے مشہور کہانیوں کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ فرمائش پر میں نے افتخار عارف سے وعدہ کیا کہ عسکری صاحب کی کسی کہانی کو ڈرامائی شکل میں منتقل کر کے پیش کروں گا۔

یہ وعدہ کر کے میں لاہور آ گیا۔ عسکری صاحب تک یہ خبر پہنچی۔ اور اب زمانہ وہ تھا کہ عسکری صاحب نے ریڈیو سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور ٹی وی سے قطع تعلق کا کیا سوال' اس سے تو شروع دن سے تعلق رکھا ہی نہیں تھا۔ تو اچانک مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا۔ نہایت روکھا خط۔ نہ دعا سلام' نہ خیر عافیت' نہ کوئی گپ شپ۔ صرف چند سطریں کہ میں نے سنا ہے تم میری کسی کہانی کو ٹی وی کے لیے ڈرامہ میں ڈھال رہے ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ لو کہ میں تمہارے خلاف عدالتی کاروائی کروں گا۔

میں خط کو پی گیا۔ پھر مہینوں بعد ملاقات ہوئی تو نہ میں نے اس خط کا حوالہ دیا نہ انہوں نے ایسا کوئی ذکر کیا۔ اور انہیں ذکر کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ مقصد تو پورا ہو گیا۔ میں نے پھر کان پکڑے اور ان کی کہانی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

لو میں اپنے آپ کو خواہ مخواہ بیچ میں لے آیا۔ ذکر تو یہ تھا کہ عسکری صاحب کو آشنا سے اجنبی بنتے دیر نہیں لگتی تھی۔ ہمعصروں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا۔ کرشن چندر کی مثال سامنے ہے جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ اپنے اردو کے لکھنے والوں کو چھوڑیئے' مغرب کے کیسے کیسے جید لکھنے والے کے ساتھ انہوں نے یہی سلوک کیا۔ کہاں اٹھتے بیٹھتے اس کا کلمہ پڑھا جا رہا ہے' کہاں ایسے فرنٹ ہوئے کہ نام سننے کے روادار نہیں۔ آخر کے تئیں مغرب کی پوری ادبی اور فکری روایت اسی سلوک کی مستحق ٹھہری۔ ارے دوسروں کی جانے دو' خود اپنی تحریروں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنی کیسی کیسی تحریر اس رنگ سے متروک ہوئی کہ جیسے وہ ان کے قلم سے نکلی ہی نہیں تھی۔ زاہد ڈار ایک مرتبہ ملا تو کہا کہ ''عسکری صاحب' آپ نے تو ایک وقت میں پاکستان کے ادیبوں کو یہ نصیحت بھی کی تھی کہ پاکستان کے عوام نے جو نہر کھودی ہے وہ ایسا واقعہ ہے کہ ادیبوں کو اس پر افسانے اور نظمیں لکھنی چاہئیں۔''

عسکری صاحب نے انجان بن کر پوچھا کہ ''میں نے یہ کہاں لکھا تھا۔''

زاہد ڈار بولا ''مجھے ایک کباڑیئے کے یہاں سے ''ساقی'' کا پرچہ ملا تھا۔ اس میں آپ کا ایک مضمون تھا جس میں یہ بات لکھی گئی تھی۔''

بولے ''پھر اس کباڑیئے ہی نے وہ مضمون لکھا ہو گا۔''

ویسے سرقہ کے الزام کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس زمانے کی اپنی اٹرم سٹرم تحریروں کے بارے میں پوچھنے پر میں بھی یہی جواب دیتا۔ اور ہاں ابتدائی برسوں میں کوئی یہ قیاس کر سکتا تھا کہ عسکری صاحب باقی سب ادیبوں کو کنڈم کر کے انہیں معتوب و مقہور ادیبوں کو

رعایتی نمبر دے کر پاس کرتے چلے جائیں گے اور بات اس طرح شروع کیا کریں گے کہ ترقی پسندوں نے ادب میں کم از کم اتنا تو کیا تھا کہ ..... اور صرف اتنا ہی نہیں ہوگا کہ سید سبط حسن سے شیر و شکر ہو جائیں گے بلکہ سوویت روس بھی اب اتنا معتبر ٹھہرے گا کہ ہنگری میں اس کی فوجی کاروائی بھی انہیں جائز نظر آئے گی۔ تو عسکری صاحب کو بدلتے دیر نہیں لگتی تھی۔ گھڑی میں رن میں گھڑی میں بن میں۔ مگر یہ کہ دنیاوی مصلحت کے تحت وہ کبھی نہیں بدلے۔ بس دل و دماغ میں بگولے اٹھتے رہتے تھے۔

رہ گئے ترقی پسند تو انہوں نے عسکری ایسے نظریاتی قسم کے دشمنوں پر قناعت نہیں کی۔ بہت جلدی اپنے دشمن اور طرح کے بھی پیدا کر لیے جنہوں نے لام بندی خالص سیاسی اور صحافتی رنگ سے کی۔ اس کا بڑا مورچہ شورش کاشمیری کا ہفت روزہ ''چٹان'' تھا۔ کبھی کبھی ایسا رن پڑتا کہ لپاڈگی تک نوبت آ جاتی۔ ایسے ہی ایک ہنگامہ کے موقعہ پر صفدر میر نے اعلان کیا تھا کہ میں خالی ترقی پسند نہیں ہوں، باکسر کا مکا کتنا کام دکھا سکتا ہے۔ اب جو ترقی پسند کانفرنس ہوئی اس پر کچھ اسی قسم کا حملہ ہوا تھا۔ میں اس کا چشم دید گواہ نہیں ہوں کہ میں تو اس وقت ''امروز'' کے دفتر میں آ گیا تھا۔ سو میرا بس اس حد تک مشاہدہ ہے کہ اس کانفرنس پہ ہلہ بول کر جب ہجوم واپس ہوا تو اس کا رخ ''امروز'' کے دفتر کی طرف ہو گیا۔ شاید انہوں نے طے کیا تھا کہ ہاتھ کے ہاتھ سرخوں کے اس اخبار کا بھی ادھار چکا دیا جائے۔ پہلے نعروں کی آوازیں آئیں۔ پھر ایک مشتعل ہجوم اندر گھس آیا۔ قیادت اس ہجوم کی سیف الدین سیف کر رہے تھے۔ رات کی شفٹ ڈیسک پر اپنے کام میں مصروف تھی۔ سیف صاحب نے ایک نظر میں سب کا جائزہ لیا۔ پھر ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ سیف صاحب سے بس کسی وقت سرسری سا تعارف ہوا تھا۔ اور شاید میرا جورجعت پسند کے طور پر نام نکلا ہوا تھا وہ اس سے نا آشنا نہیں تھے۔ اور حسن اتفاق سے ہمارا وہ رفیق جس کا نام کمیونسٹ کے طور پر جانا جاتا تھا وہ اس وقت تھا ہی نہیں۔ حمید ہاشمی اس وقت کانفرنس میں گیا ہوا تھا۔ سیف صاحب ٹھٹھکے۔ پھر مشتعل ہجوم سے مخاطب ہوئے ''ارے ان غریبوں کی کیا خطا ہے۔ چلو واپس چلو۔''

اور ہجوم واپس ہو لیا۔

◆◆◆

اغیار کا بائیکاٹ

25 جولائی 1948ء کی تاریخ پڑی ہے۔ یہ خط لکھنؤ سے آیا تھا۔ حیران ہوں کہ یہ خط کون سے کونے کھدڑے میں پڑا رہ گیا تھا کہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔ اب جب میں پرانے کاغذات ٹٹول رہا ہوں کہ پچاس برس پہلے کی کوئی تحریر برآمد ہو جائے تو کاغذ کی کوئی چندی تک نہیں مل رہی۔ نہ ''نظام'' کا کوئی شمارہ میرے پاس محفوظ ہے نہ کوئی رقعہ پرچہ۔ حالانکہ کتنے خط میں نے لکھے تھے اور کس کس بزرگ نے مجھے جواب سے نوازا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیچ ایک خونیں سرحد کے باوجود خط و کتابت اس طرح ہوتی تھی جیسے کوئی سرحد نہیں ہے۔ اور پاک ہند معاملات کی نزاکت کے باوجود ڈاک کی سنسر کا بھی ایسا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ایسا ہوتا تو سہیل عظیم آبادی کے ظالم خط سنسر کی زد میں آنے سے کیسے بچ جاتے۔ چلو ''نظام'' کے وہ ورق تو مجھے دستیاب ہو گئے جن میں یہ خط چھپے ہیں۔ باقی پرچے جن میں ان کے موقف کے حق میں اور خلاف لکھی جانے والی تحریریں چھپیں فراہم ہو جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ان کی مدد سے مجھے کتنا کچھ یاد آ جاتا۔ اب مجھے دھیرے دھیرے کر کے کتنے ہی خط یاد آ رہے ہیں جو مجھے قاعدے سے ''نظام'' کی ڈاک کے فائل سے نکال کر محفوظ کر لینے چاہیے تھے۔ وہ مجھے اس زمانے کے معاملات کو اپنے حافظہ میں زندہ کرنے میں کتنی مدد دیتے۔ پرانے خطوط کا معاملہ بھی کچھ پرانے گانوں کا سا ہوتا ہے۔ کوئی پرانا گانا سنیں تو اس کے ساتھ وابستہ کتنی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ پورا ایک عہد زندہ ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ پرانے خطوں کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ پرانا خط اپنے ساتھ کتنی پرانی یادیں لے کر آتا ہے۔ احتشام صاحب کا خط جو 25 جولائی 1948ء کو لکھا گیا میرے سامنے ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے رفتہ رفتہ اس زمانے کے کتنے معاملات یاد آ رہے ہیں۔ یاد آ رہا ہے کہ جو مسئلہ گرم تھا اس حوالے سے میں نے احتشام صاحب کے خلاف بھی کچھ لکھا تھا۔ ادھر سے جواب کتنے شفقت آمیز اور کتنے رسانیت کے لہجہ میں آیا۔ اسی کے ساتھ یاد آ رہا ہے کہ کچھ اور خط بھی تو کچھ اسی مضمون کے آئے تھے۔ کم از کم مہندر ناتھ کا خط تو میرے پاس محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ دوستی اپنی جگہ' معاملات و مسائل پر اختلاف اور برہمی اپنی جگہ۔ الزام سارا عسکری صاحب کے سر لکھا کہ عسکری کی صحبت نے تمہیں خراب کیا ہے۔ بوجھو کہ مہندر ناتھ سے میرا کیا تعلق تھا۔ میں نے تو افسانہ نگار کی حیثیت سے آنکھ ہی پاکستان میں آ کر کھولی تھی۔ پھر مہندر ناتھ سے میرا دوستانہ تعلق کب اور کیسے قائم ہوا۔ اور اب جب میں یہ بتانے لگا ہوں تو کرشن چندر کے دلی والے گھر میں مجھے وہ اپنی صبح یاد آ رہی ہے جب مہندر ناتھ نئے

ادب اور خاص طور پر ترقی پسند ادب کے بارے میں رواں تھے اور میں نیاز مندی کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ادھر سرلا رسوئی میں بیٹھی پکوڑے تل کر بھیج رہی تھی۔ مہندر ناتھ کی گفتگو کی اپنی لذت' سرلا کے ہاتھ کے تلے پکوڑوں کی اپنی لذت۔ مگر یہ دوسری لذت ریوتی کے لئے تھی۔

قصہ یوں شروع ہوا کہ ایک مرتبہ ریوتی دلی سے محض ایک خبر سنانے کے لیے ہاپوڑ آیا اور بڑی گرمجوشی سے مجھے ایک خبر سنائی ''یار' ایک لڑکی ہے۔ میں نے اسے اردو پڑھانی شروع کی ہے۔''

''اچھا۔۔۔۔۔۔۔لڑکی خوبصورت ہے؟''

اس سوال کو اس نے گول کر دیا' کہا کہ اس کے بھائی کا تقاضا تھا کہ تم اردو سیکھو۔ پتہ ہے بھائی کون ہے؟''

''کون ہے؟''

''کرشن چندر''

''کرشن چندر کی بہن؟'' اچانک ساری صورتحال ہی بدل گئی۔ میں نے شوق سے اس لڑکی کے بارے میں ایک ایک تفصیل پوچھی۔

بات اردو پڑھانے سے شروع ہوئی تھی۔ مگر بات اس سے آگے نکل گئی۔ اور وہ مرحلہ آ گیا کہ میرا بھی اس سے ملنا ضروری ہو گیا۔ آخر دیکھنا تو تھا کہ دوست کہیں غلط جگہ تو نہیں پھنس گیا۔ خیر وہ عام معنوں میں تو خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ نہ کوئی چاند کا ٹکڑا' نہ کوئی زہرہ جبیں۔ اس کی اپنی ہی ایک پھبن تھی۔ سیدھی سادی شکل وصورت' سانولی رنگت' چھریرا بدن' بر میں سادہ سی سفید سوتی ساڑھی' کوئی ناز وادا والی بات نہیں' طور اطوار' نشست وبرخاست' بول چال' سب میں ایک سادگی اور متانت۔

پھر پورے خاندان کو دیکھا سوائے کرشن چندر کے۔ ماتا پتا دونوں بہت سیدھے اور شریف۔ مہندر ناتھ کی شخصیت میں اپنا ایک جادو تھا۔ میں فوراً ہی اس شخصیت سے متاثر ہو گیا۔ اسی اثر میں آ کر ان کے افسانوں کے مجموعہ ''چاندی کے تار'' پر ایک مضمون باندھ ڈالا جو ''نظام'' بمبئی میں چھپا۔ لیجئے دوستی پکی ہو گئی۔

ہاں جب ریوتی کے ماتا پتا کے کان میں یہ بھنک پڑی تو قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ کرشن چندر کا خاندان کائستھ۔ ادھر ہمارا دوست برہمن بچہ۔ اس کے پتا جی نے مجھے بلا بھیجا'' سنا تم نے' تمہارے متر نے دلی جا کر کیا گل کھلایا ہے۔ ذات گوت تو دیکھ لی ہوتی۔ اسے سمجھاؤ۔''

میں نے سمجھانے کا وعدہ کیا۔ اور پھر ریوتی سے آ کر کہا کہ ''تیرے پتا جی تو بہت تاؤ میں آئے ہوئے ہیں۔ اب تو سوچ لے' پچک تو